جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ

جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب تقریباً چار دہائیوں تک آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کے موقر وممتاز پارلیمنٹرین رہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی صف اول کے رہنما و قائد رہے۔ انہوں نے عمر بھر صرف ملت اسلامیہ ہندیہ ہی کی لڑائی نہیں لڑی بلکہ وہ اقلیتوں، مظلوموں اور انصاف کے لئے برسرپیکار رہے لیکن افسوس کہ اردو وانگریزی اخبارات میں ملک وملت کی خدمت میں اپنی عمر کھپا دینے والی اس قدآور شخصیت پر جو چند ایک مضامین آئے وہ سیٹھ صاحب کی شایان شان نہیں تھے۔ "مردہ پرست" کہلانے والی ملت نے اپنے اس بےلوث خدمت گزار اور مثالی قائد کو خراج پیش کرنے کے سلسلے میں جس بے حسی اور ان کی گرانقدر خدمات سے جس ناواقفیت کا ثبوت دیا وہ ایک افسوسناک امر ہے۔ اسی تاثر کی بناء پر درج ذیل چند صفحات سپرد قلم کے گئے ہیں۔ امید کہ قارئین اسے نگاہ شوق سے پڑھیں گے۔ (ا۔ش۔)

۲۷/اپریل ۲۰۰۵ء کو عمر کی ۸۲ بہاریں پوری کرکے ابراہیم سلیمان سیٹھ نے علی الصبح ۵:۳۰ بجے بنگلور کے ایک اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا ان کی اہلیہ محترمہ پہلے ہی انہیں داغ مفارقت دے چکی تھیں لیکن سیٹھ صاحب محض اپنے اعزا واحباب سے وداع نہیں ہوئے بلکہ اپنے پیچھے پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کو سوگوار چھوڑ گئے، ان کے پسماندگان میں دو بیٹے سلیمان خالد اور سراج ابراہیم اور تین بیٹیاں ہیں، ان کی رہائش گاہ جو کوچی میں واقع ہے، کا نام "الہلال" ہے جو اُن کی دین پسندی اور رجائیت پسندی کا عکاس ہے اور جس مکین کے بام ودر یہ پیغام دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے سیاسی افق کا ہلال ایک نہ ایک دن بدر منیر ضرور بنے گا، اُن کا جسد خاکی ان کی صاحبزادی کی رہائش گاہ واقع بنگلور میں لایا گیا اور بنگلور کے

ہی قدوس صاحب قبرستان کو ان کی آخری آرام گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔

سیٹھ صاحب کا جنم ۳؍ نومبر ۱۹۲۲ء تلاشری (کنور، کالی کٹ) میں ہوا تھا۔ ان کے والد ماجد کا نام سلیمان سیٹھ تھا جن کی میسور میں کپڑوں کی تجارت تھی، ان کی والدہ ماجدہ کا نام زینب بی تھا۔ سیٹھ صاحب کا بچپن ولڑکپن ان کی جائے پیدائش تلاشری میں گزرا اور ابتدائی وسکنڈری اور کالج تک کی سطح کی تعلیم انہوں نے تلاشری میں ہی حاصل کی، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات ان کے موضوع رہے۔

وہ کالج میں تاریخ کے معلم رہے، شاید اسی لئے ملت اسلامیہ کے روشن ماضی کی بازیافت ان کے فکر وعمل کا میدان بن گئی۔ اس کے لئے وہ زندگی بھر ایک سچے معلم کی طرح کوئلہ کے مانند سلگتے رہے اور اس معلمانہ آنچ نے نہ جانے کتنوں کو حرارت ایمانی سے روشناس کیا۔ روشن ماضی کی بازیافت کے جذبہ ہی کی وجہ سے ۱۹۴۶ء میں انہوں نے کالج کو خیرباد کہہ دیا، گویا یہ بھی ایک تقدیری امر تھا اور قدرت کو ان سے خیر کے اور اُمت کی خیرخواہی کے بڑے کام لینے تھے۔

میسور کے گورنمنٹ کالج سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اسی اثناء میں وہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسوں میں ایک مقرر کی حیثیت سے شریک ہوا کرتے۔ ۱۹۴۳ء میں فیڈریشن کے جلسہ میں کی گئی ان کی تقریر کی بڑی شہرت ہوئی۔

زینب بی صاحبہ کے ایک عزیز جناب ستار سیٹھ ہوا کرتے تھے، وہ سیاسی ذوق کے حامل تھے اور ان کی نگاہ مردم شناس نے سیٹھ صاحب میں موجود قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگالیا تھا۔ چنانچہ سیٹھ صاحب مرحوم کے سیاسی گرو ستار سیٹھ ہی ٹھہرے۔

سیاست کی پُرخار وادی میں عملاً سیٹھ صاحب نے ۱۹۶۰ء میں راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے قدم رکھا اور اس عرصہ میں عوام میں اپنی محبوبیت ومقبولیت کا ایسا سکہ جمایا اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا وہ لوہا منوایا کہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۹۲ء تک وہ مسلسل پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوتے رہے پہلی بار وہ کالی کٹ سے منتخب ہوئے اور پھر لگاتار پانچ مرتبہ منجیری سے لوک سبھا کے لئے منتخب ہوتے رہے، تسلسل کے ساتھ لوک سبھا کے لئے ان کا یہ انتخاب

ایک ریکارڈ اور تاریخ ہے۔ لوک سبھا کی ان کی رکنیت کی اس مدت میں دس وزراء اعظم اپنے اپنے منصب عظمیٰ پر آئے اور رخصت ہوئے۔

مسلم لیگ کو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم نے ''مردہ گھوڑا'' کہا تھا، ابراہیم سلیمان سیٹھ کا نام اس لحاظ سے ان جیالوں، جانبازوں اور قلندرانہ شان اور مومنانہ جرأت و جسارت رکھنے والوں میں لکھا جائے گا کہ جس پارٹی کو تقسیم ملک کی ذمہ دار ٹھہرا کر اسے مطعون کیا جارہا تھا، اس نہایت نازک اور قیامت کی گھڑی میں سیٹھ صاحب نے مسلم لیگ کا پرچم نہ صرف تھامے رکھا بلکہ اس سبز ہلالی پرچم تلے غمزدہ ومظلوم مسلمانوں اور اقلیتوں کو اکٹھا بھی کیا۔ گویا ع

شورش عندلیب نے روح، چمن میں پھونک دی

۱۹۴۱ء میں سیٹھ صاحب نے مسلم لیگ کے اس جلسہ سے خطاب کیا تھا جس میں محمد علی جناح، لیاقت علی خاں اور فضل الحق جیسے صف اول کے رہنما موجود تھے جبکہ اس وقت سیٹھ صاحب کی عمر محض ۱۹؍برس تھی۔

حصول آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں سلطان ٹیپو کی بہادری وشجاعت کی داستانوں کے شاہد وامین شہر میسور مسلم لیگ کے سیٹھ صاحب صدر ہوئے۔ کیرالہ کے شہر ارناکلم کے وہ ۱۹۵۲ء میں صدر رہے اور ان کی انتظامی و مدبرانہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں ۱۹۵۶ء میں ریاستی مسلم لیگ کا خازن مقرر کیا گیا، ۱۹۶۱ء میں وہ پارٹی کے جنرل سکریٹری کے منصب پر فائز ہوئے اور قائد ملت مولانا محمد اسماعیل اور عبدالرحمٰن بافقیہ تھنگل صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۷۳ء میں وہ انڈین یونین مسلم لیگ کے صدر منتخب قرار دیئے گئے۔

یہ تفصیلات تو ہوئیں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم اور اس کے لئے سیٹھ صاحب کی خدمات سے متعلق، لیکن سیٹھ صاحب کو اللہ نے جس درد وسوز، تڑپ وکڑھن اور ملت کے لئے جینے اور مرنے کا سلیقہ وحوصلہ بخشا تھا اس کا فطری تقاضہ تھا کہ یہ شہاب ثاقب کشمیر سے کنیا کماری تک کی ملت اسلامیہ کے لئے بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کا کام دیتا، سیٹھ صاحب محض ایک چشمہ نہیں سمندر کا ایک کردار نبھاتے اور ملک بھر کی اقلیتوں اور

مظلوموں کے لئے سر چشمہ فیض بن جاتے اور اس شاعرانہ تخیل کے عملی مصداق ہوتے

تڑپ صحن چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو نہیں سکتی تقدیر سیمابی

واقعہ یہ ہے کہ سیٹھ صاحب کی فطرت میں قدرت نے سیمابیت رکھی تھی اور پھر تقریباً ۳۵ ؍برسوں تک لوک سبھا کی مسلسل رکنیت کی بدولت ان کی شہرت وخدمت ناریل کے دیس سے باہر بھی اپنا لوہا منوا چکی تھی۔ سیٹھ صاحب مرحوم نے ایک طرف کیرالہ کی اقلیتوں کو مسلم لیگ جیسا منظم ومتحدہ پلیٹ فارم عطا کر دیا تھا کہ وہاں کا مسلمان برابر اقتدار میں حصہ دار رہا، سر اٹھا کر اور عزت نفس کے ساتھ جیتا رہا اور تعلیمی واقتصادی میدانوں میں برادران وطن کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی کوئی ریاست زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں اور اقلیتوں کی ایسی مسلسل ترقی کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سیٹھ صاحب کی ان ہی کلیدی اور نمایاں خدمات نے انہیں عوام کی زبان سے ’’محبوب ملت‘‘ کہلوایا اور ان کی محبوبیت کا کیرالہ کی عوام میں یہ عالم تھا کہ جب ایک ماں منا کر اور بہلا کر اپنے بچہ کو کھانا کھلاتی تو کہتی دیکھو محبوب ملت ابراہیم سلیمان سیٹھ آ رہے ہیں۔ اس طرح پانچ سال کی کم عمر کا بچہ بھی اپنے محبوب ملت کے نام سے واقف ہو جاتا اور اس کے دل میں سیٹھ صاحب کی محبت جاگزیں ہو جاتی۔

دوسری طرف سیٹھ صاحب کی غیر معمولی دردمندانہ اور خلوص پر مبنی ملی خدمات کی ایک طویل تابناک فہرست ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی لڑائی لڑی جارہی تھی۔ سیٹھ صاحب نے اس میں کلیدی رول ادا کیا اور ۱۹۸۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی جنگ جیت لی، وہ صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ سچ پوچھئے تو مظلوموں کے رہنما تھے۔ چنانچہ انہوں نے منڈل کمیشن رپورٹ کی حمایت کی، ٹاڈا کے بے قصور مظلومین کی رہائی کا پرزور مطالبہ کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایشو (Issue) پر بھی وہ حق گوئی سے کام لیتے رہے۔ ایک پارلیمنٹرین کی حیثیت سے دستور ہند پر ان کی نگاہ بڑی گہری تھی اور دستور ہند کے دائرہ میں رہتے ہوئے مسلمانوں، اقلیتوں اور مظلوموں کے

حقوق کی بازیابی میں کبھی بھی انہوں نے پس وپیش سے کام نہیں لیا۔ مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل میں بھی ان کا بڑا اہم رول رہا۔

۱۹۶۴ء میں جب جبلپور اور راوڑ کیلا میں خون آشام فسادات ہوئے اور ڈاکٹر سید محمود نے حالات کی نا مساعدت اور صاحبان اقتدار کی مخالفت کے باوجود مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالی اور واضح طور سے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ مسلمان ہندوستان میں دوسرے درجہ کے شہری بن کر رہنا ہرگز گوارہ نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر سید محمود کے اس ریمارک پر پنڈت نہرو کو بھی سوچنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ سیٹھ صاحب حصول آزادی کے بعد ملت کی بقاء اور اس کے تحفظ کے لئے کی جانے والی ہر کوشش میں شریک رہے اور انہوں نے بنیادی کردار نبھایا۔ بابری مسجد کی بازیابی کی کوششوں میں نہ صرف وہ پیش پیش رہے بلکہ بابری مسجد کی شہادت سے وہ اس قدر دلبرداشتہ، رنجور، مغموم اور متاثر ہوئے کہ انہوں نے کیرالہ میں کانگریس کی بیساکھی پر مسلم لیگ کے اقتدار کو بھی صرف اس بنیاد پر قربان کردینا چاہا کہ مسجد کی شہادت میں کانگریس ملوث تھی۔ وہ ایک غیرت مند مسلمان تھے، حمیت و خودداری ان کے خمیر میں داخل تھی۔ عند اللہ مسؤلیت کا ان کو احساس تھا اور وہ اپنے اللہ کے حضور اس حال میں نہیں جانا چاہتے تھے کہ وہ اقتدار کی لالچ میں اللہ کے گھر کے قاتلوں سے سازباز کیے رہیں۔ انہیں اس کا یقین تھا کہ دنیا فانی ہے اور یہ جان ایک دن جانی ہے۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات، کار جہاں بے ثبات

وقت گزر گیا اور اس دور کی حکومت بھی مدت پوری کر چکی لیکن سیٹھ صاحب اللہ کے یہاں اس حال میں حاضر ہوئے کہ اللہ کے ایک گھر کی شہادت پر وہ رنجور وملول تھے اور عملاً انہوں نے اپنی دینی غیرت وحمیت کا وہ ثبوت فراہم کردیا جو ان کے لئے انشاء اللہ توشہ آخرت ثابت ہوگی اور انشاء اللہ غیور خداوند قدوس نے بھی اپنے اس باحمیت بندہ کے ساتھ مغفرت اور لطف وکرم کا معاملہ کیا ہوگا۔ شریعت میں مداخلت کے تناظر میں جب آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل ہوئی تو ان کے عملی کاموں میں بھی سیٹھ صاحب پہلی صف

میں ہی نظر آتے، شاہ بانو کیس کے سلسلے میں سیٹھ صاحب کی میدانی اور پارلیمانی جدوجہد دونوں یاد کی جائیں گی، ملی کونسل کا جن دنوں قیام عمل میں آیا تھا اور قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی کے دہلی میں ملت کے درد کا درماں ڈھونڈ نکالنے کی ایک ہوک سی اٹھی ہوئی تھی اور اتحاد بین المسلمین کا ان کے سر میں سودا سمایا ہوا تھا تو دوسری طرف اس مجاہد کی مخالفت بھی ہو رہی تھی لیکن سیٹھ صاحب کی جہاں دیدہ اور دانا و بینا شخصیت حضرت قاضی صاحب کے ساتھ تھی جس نے ملی کونسل کو بھی ایک اعتبار بخشا، اس کے علاوہ وقف کونسل اور سینٹرل حج کمیٹی کو بھی ان کے رکن کی وجہ سے خدمات حاصل رہیں۔ کیرالہ یونیورسٹی کی کورٹ کے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے بھی وہ ممبر رہے۔

جیسا کہ ہوتا آیا ہے، مظلوموں اور مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی کے لئے آواز بلند کرنے والوں کو انتہا پسند، بنیاد پرست اس سے آگے بڑھ کر دہشت گرد بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس کا مظاہرہ چوراہوں سے لے کر پارلیمان کے ایوانوں تک بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کیا جاتا ہے، سیٹھ صاحب کو بھی ان خطابات سے نوازا گیا لیکن سیٹھ صاحب نے ملک کی ایکتا کے لئے اور اس کے بقاء واستحکام کے لئے فاشزم اور فاشسٹ قوتوں کو برابر للکارا، وہ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہ کہہ سکے اور محض ان کے بالمقابل سیکولرزم کی حمایت کو برابر جاری رکھا دراصل وہ محض مسلمانوں کی نہیں بلکہ انصاف کی لڑائی لڑتے رہے، وہ غیر جانبدار نہیں، حق کے طرفدار تھے۔ ایمرجنسی کے دوران جب قدآور رہنمایان ملک وملت قید و بند کی صعوبتیں اٹھا رہے تھے اور سیٹھ صاحب کی گرفتاری اس وقت تک عمل میں نہیں آئی تھی تو انہوں نے اس وقت کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی سے کہا تھا:

I want to get arrested. I am against emergency and the compulsory sterilization.

"میں بھی گرفتار ہو جانا چاہتا ہوں۔ میں ایمرجنسی اور لازمی نس بندی کا مخالف ہوں۔"

اس طرح سیٹھ صاحب نے اسلامی شعائر کے سلسلے میں کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا، اسلام کی سربلندی اور ملت کے لئے آبرومندانہ زندگی کے شعور واحساس نے انہیں اپنی

حیات مستعار میں بے قرار رکھا۔ ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل مصر سے برسرپیکار تھا، سیٹھ صاحب نے فلسطین کانفرنس کا انعقاد کیا، یاسر عرفات سے بھی ان کی ملاقات رہی۔ وہ مظلومین کے لئے ریشم کی طرح نرم تھے اور ظالموں کے بالمقابل صورت فولاد۔

بیرونی ممالک کے اسفار تو اب ہر کس و ناکس کو پیش آنے لگے ہیں لیکن سیٹھ صاحب نے مختلف انٹرنیشنل اسلامک کونشن میں شرکت کے لئے لندن، واشنگٹن، نیویارک، بغداد، جدہ، تہران، عمان، اسلام آباد، انگار اور کولمبو وغیرہ کے سفر کئے اور اپنا صاف ستھرا اور واضح موقف پیش کیا، ان کو اردو کے ساتھ انگریزی زبان پر غیر معمولی عبور تھا، اپنے پارلیمانی حلقہ میں انگریزی ہی میں تقریر فرماتے تھے۔ اقبالیات اور غالبیات سے انہیں خصوصی شغف تھا اور اپنی تقاریر میں وہ برمحل ان شعرائے کرام کے اشعار کا استعمال کرتے تھے، انہوں نے خود شعر بھی کہے، مشق سخن بھی کی، کاش کہ ان کی شاعری محفوظ ہو جس سے ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے، ان کی تقریروں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوا کرتی کہ وہ قرآن حدیث سے آراستہ ہوتیں۔ قرآن پاک کی تلاوت، اس کے معنی و مفہوم کو سمجھنا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ان کے مزاج میں شامل تھا، ملیالم سمجھتے تو خوب تھے لیکن روانی سے بولتے نہیں تھے۔ اور مترجم قرآن و حدیث کے ترجمہ میں غلطی کرتا تو فوراً ملیالم میں ہی اس کا ترجمہ کر دیتے۔ ان کی غیرت اس میں غلطی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

یہاں تک ایک سیاست داں اور مدبر کی حیثیت سے ان کی زندگی کے ان چند ایک پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی لیکن اصل مسئلہ ہے انسان کا انسان ہونا اور مسلمان کا مطلوبہ کردار کا حامل ہونا۔ اس لئے کہ آدمیوں کی بھیڑ میں آج انسان کو انسان ہونا بھی میسر نہیں ہے۔ سیٹھ صاحب کی شناخت ایک مسلم رہنما کی تھی، مسلم دشمنی میں طاق سیاست دانوں سے بھی ان کا واسطہ پڑتا رہا، ملت کی کشتی کو انہوں نے بھنور میں اپنی آنکھوں سے دیکھا، مظلومین کی دردبھری داستانیں اور فریادیں سنیں، فسادات کے روح فرسا حادثات کے چشم دید گواہ رہے، عالمی نقشہ پر مسلمانوں کی بے وزنی اور بے دلی کو دیکھتے رہے اور واقعات کی سب سے بڑی حقیقت یعنی دنیا کی بے ثباتی اور پھر عنداللہ مسئولیت ان کا ایمان و عقیدہ رہا

ان تمام حقائق وواقعات کی وجہ سے سوز وگداز میں ڈوبے ہوئے ان کے دل پر اثر قائم ہونا ایک ناگزیر عمل تھا۔اس کے علاوہ ساحل پر بیٹھ کر انہوں نے محض تماشہ نہیں دیکھا تھا بلکہ براہ راست موجوں سے وہ لڑے تھے اور باطل سے یہ پنجہ آزمائی حرارت ایمانی اور خدا اعتمادی کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ کہنے والے نے سچ کہا۔

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

یہی ایمانی حرارت اور تعلق مع اللہ تھا جس نے انہیں جرأت ایمانی بخشی تھی اور نتیجہ میں انتہائی ناسازگار حالات میں بھی ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق'' کا ان سے مظاہرہ کرواتی تھی۔

۲۰ رسال سے وہ دل کے مرض میں مبتلا تھے،لندن میں بائی پاس سرجری بھی ہوئی تھی۔معالجین نے انہیں آرام کرنے اور تناؤ سے بچنے کا مشورہ بھی دیا تھا،لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ ان کا یہ مریض جس ''درد دل'' میں مبتلا ہے، وہی درد اس کی عین زندگی ہے اور اسی درد کے سبب وہ جیتا ہے اور فانی جسم کی صعوبتوں کو برداشت کرتا ہے۔

سیٹھ صاحب کی زندگی کا ایک اہم گوشہ ان کی درویشانہ صفت زندگی تھی۔آخری دنوں میں ممبر راجیہ سبھا جناب پی وی عبدالوہاب صاحب نے سیٹھ صاحب کے لئے ایک کار خرید کردینے کی فرمائش کی لیکن سیٹھ صاحب نے بلا توقف یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ وہ کار ڈرائیور کے مشاہرہ کو ادا کرنے کے متحمل نہیں ہیں۔

سیٹھ صاحب نے ایک متمول گھرانہ میں آنکھیں کھولی تھیں والد مرحوم کپڑوں کے اچھے تاجر تھے لیکن سیٹھ صاحب اس معاملے میں بے نیاز رہے، علی العموم آج کا سیاست داں اپنی کئی پشتوں کی فکر کرتا اور ان کے لئے نظم کر جاتا ہے لیکن سیٹھ صاحب کا خمیر جس مٹی سے اٹھا تھا اس میں خدا خوفی اور دنیا سے بے نیازی کا عنصر غالب تھا، ان کو کھو کر پانے میں مزہ آتا تھا، اپنے گھر میں اندھیرا انہیں گوارہ تھا لیکن وہ دوسروں کے یہاں روشنی دیکھنا چاہتے تھے۔چنانچہ انہوں نے پونجی جمع نہیں کی بلکہ خرچ کی اور ملی وسماجی ضرورتوں اور تقاضوں پر صرف کی اور جب ان کا انتقال ہوا تو حال یہ تھا کہ ۳۵ رسال تک ایوان پارلیمان کے اس

ممبر کے یہاں ایس ٹی ڈی کی سہولت تک نہیں تھی۔ وہ اقبالؔ کے اس شعر کی عملی تفسیر تھے

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز

مسلم لیگ کے جس پودے کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا اور اس زمانہ میں سینچا جب اس پارٹی کا نام لینا ایک بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا، اس سے علیٰحدگی سے ان کے دل پر کیا کچھ نہ بیتی ہوگی لیکن داد دیجئے، تعلقات کو ہر حال میں استوار رکھنے کی ان کی اس ادا کی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ انڈین یونین مسلم لیگ اور نیشنل لیگ دونوں ہی میری پارٹیاں ہیں اس لئے کہ دونوں کا مشن ایک ہے۔ امور خارجہ کے وزیر مملکت جناب ای احمد صاحب جب مسلم لیگ کے ٹکٹ سے کامیاب ہوئے تو سیٹھ صاحب نے دیرینہ تعلقات کو نبھایا اور سیاسی علیٰحدگی کو اہمیت دیئے بغیر دلی جاکر کیرالہ ہاؤس میں انہیں مبارکباد پیش کی۔ پارٹی سے علیٰحدگی کی سیٹھ صاحب کی بنیاد عنداللہ مسئولیت کا احساس تھا پھر وہ دیرینہ رشتوں میں کیوں کر آڑے آتا۔

سیٹھ صاحب انسان دوست تھے، انسانیت نواز تھے۔ مسلمانوں کے نقیب، اقلیتوں کی آواز، ان کے حقوق کی بازیابی ان کا مقصد حیات!! اس لئے وہ ہدف ملامت بھی بنتے رہے، لیکن ان کی اس طویل سیاسی جدوجہد میں کوئی ایسی مثال نہیں پیش کی جاسکتی کہ انہوں نے دوسرے مذاہب کی توہین کی ہو۔ تریوندرم میں ان کا قیام اپنے غیر مسلم دوستوں کی رہائش گاہ پر ہوا کرتا، دراصل وہ اکرام انسان کے قائل تھے۔

دنیا کی بے ثباتی سب کو معلوم ہے لیکن دنیوی جاہ و منصب اور اقتدار کی چمک دمک میں اس کا استحضار آسان کام نہیں، یہ خدا کی توفیق ہی تھی کہ سیٹھ صاحب نے اسے عملاً کر دکھایا اپنے سرکار کی اُمت کا غم وہ مرد خدا عمر بھر کھاتا رہا، ظاہری اسباب کی دنیا میں عارضہ قلب ان کی موت کا سبب بنا لیکن وہ تو قدرت کے پاس سے وہ درد دل لائے تھے جس کو اقرار و اطمینان اپنے رب کے حضور حاضر ہونے ہی میں ممکن تھا۔ اس پاک طینت، پاک دل و پاکباز بندہ مومن کے نام انشاءاللہ جب بارگاہ ایزدی میں پروانہ مراجعت آیا

ہوگا اور اذن باریابی ہوا ہوگا کیا عجب کہ اس خوشخبری کے ساتھ کہ
”یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی۔“
زبان حال سے ان کی کتاب زندگی ان سے چاہنے والوں سے یہی مطالبہ کرتی دکھائی دیتی ہے کہ:

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں میری، آرزوئیں میری
امیدیں میری، جستجوئیں میری
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
میرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

اور

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اللہ اس سیاسی درویش و قلندر کی تربت کو ٹھنڈی رکھے اور آسماں اس مرد مومن کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔